© rasailojaraid.com

بحث ونظر

فکر اسلامی کی نشأۃ ثانیہ اور علامہ اقبالؒ

——— ڈاکٹر سید عبدالباری

علامہ اقبالؒ نے اپنے دور کے مغربی فکر و فلسفہ کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ اس کی خوبیوں اور خامیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ مغرب کے الحادی فکر اور اس کی عقلیت پسندی کا دنیا نے زبردست اثر قبول کیا اور اس کی سیاسی قوت کی وجہ سے ایک طرح کی مرعوبیت بھی ہر طرف چھائی رہی۔ اس کے مقابلہ میں بہت سے مسلمان مفکرین کا رویہ اسلام کے بارے میں معذرت خواہانہ رہا اور وہ اس کی تائید ہی کو دین کی خدمت سمجھتے تھے۔ علامہ اقبال نے اس مرعوبیت کو دور کرنے اور اسلام کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی۔ وہ اسلام کی عظمت و سربلندی کے لیے فکرمند رہے اور امت کے درمیان احیاء اسلام کے داعی بن کر ابھرے۔ یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ وہ تقلید جامد کے مخالف اور تجدید کے حامی تھے۔ لیکن انھوں نے مختلف مسائل میں اسلام کے نقطۂ نظر کو جس طرح پیش کیا وہ بحث کا موضوع بن سکتا ہے۔ اس کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس کی توقع ان ہی اصحاب علم سے کی جاسکتی ہے جو اقبالیات پر وسیع نظر رکھتے اور اس کا ناقدانہ جائزہ لے سکتے ہوں۔ پیش نظر مقالہ معلومات افزا ضرور ہے، لیکن اس کے بعض نکات قابل بحث بھی ہیں۔ اسی پہلو سے اسے شائع کیا جارہا ہے۔ (جلال الدین)

بیسویں صدی عیسوی میں مغرب کے فلسفوں نے، یوں محسوس ہورہا تھا، مشرق کے نظام فکر کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ علامہ اقبالؔ اور دیگر مفکرینِ اسلام اس صورت حال پر مضطرب تھے۔ اسی زمانہ میں ابوالکلام آزاد نے الہلال کے صفحات پر اسلامی علوم اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآنی فکروفلسفہ کی عصرِرواں میں اہمیت اور معنویت کو پورے جوش وخروش کے ساتھ پیش کیا۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقا سے لے کر مارکس کے جدلیاتی فلسفہ اور اشترا کی تصورِحیات و کائنات کا ہر طرف بول بالا تھا اور نئی نسل کا ایک بڑا طبقہ مشرق ومغرب میں مذہب کو انسانی زندگی کے مسائل وامور سے خارج از بحث قرار دے رہا تھا۔ علامہ اقبالؔ نے اپنی فارسی اور اردو شاعری کے ذریعہ مغربی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات کی لایعنیت اور قرآن حکیم کی عصرِحاضر میں افضلیت کا نغمہ چھیڑا۔ علامہ نے خطباتِ مدراس کے ذریعہ، ان کے دل میں اسلامی فکروفلسفہ کی تدوینِ نو کا جو ولولہ تھا، اس کو صفحہ قرطاس پر درج کیا۔ پھر بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں ان کے سینے میں جو چنگاریاں روشن ہوئی تھیں ان کو بڑے اضطراب کے ساتھ نمایاں کیا۔ علامہ جن موضوعات پر قلم اٹھانے کے لیے بے چین تھے ان کی تفصیلات ہمیں چونکا دیتی ہیں۔ وہ اپنے دوست سر راس مسعود کو ۲۰؍مئی ۱۹۳۵ء میں لکھتے ہیں:

”چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں۔ تمنا ہے مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلم بند کر جاؤں اور جو تھوڑی سی ہمت وطاقت ابھی مجھ میں باقی ہے اسے اس خدمت دین کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہوں“۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی اپنے مقالہ ’اقبال کے ذوقِ علم وتحقیق‘ میں رقم طراز ہیں: ”نہیں کہا جا سکتا کہ موعودہ کتاب میں اقبال کیا طریق تفسیر اختیار کرتے، لیکن اس سلسلہ کی بعض تحریروں اور گفتگوؤں سے پتا چلتا ہے کہ مقدمۃ القرآن لکھنے سے ان کی بنیادی غایت خدمتِ دین تھی اور اپنی موعودہ کتاب میں وہ امتِ مسلمہ کو قرآنی رموز ونکات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے، تاکہ مسلمانانِ عالم اس کی روشنی میں اپنے سیاسی ومعاشی مسائل حل کرسکیں۔ وہ یہ بھی ارادہ رکھتے تھے کہ اسلام اور قرآن پر یورپ کے متعصّبانہ اور بے بنیاد اعتراضات کا مدلل جواب دیا جائے۔ اگر اقبال مقدمۃ القرآن لکھنے میں کامیاب ہوجاتے تو بلاشبہ عصرِحاضر میں یہ ان کا بڑا کارنامہ ہوتا“۔[۱]

اقبال کا دوسرا منصوبہ اسلامی فقہ کی تدوینِ جدید کا تھا۔ بہ قول رفیع الدین ہاشمی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ علامہ کی سب سے بڑی خدمت ہوتی۔ صوفی تبسم کے نام ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء کے خط میں لکھتے ہیں: ''میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نگاہ سے زمانۂ حال کے اصول قانون میں ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم وہی شخص ہوگا۔[۲]

علامہ اقبال فقہ اسلامی کی مفصل تاریخ پر سخت زور دیتے تھے اور اس پر خود کام شروع کیا تھا۔ انہوں نے ایک کتاب Islam as I understand it لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ فقہ کی تدوین کے لئے انہوں نے مولانا شبلی، سید سلیمان ندوی اور سید انور شاہ کشمیری کو لاہور بلانا چاہا تھا۔[۳] ۱۹۱۵ء میں اسرار خودی کی اشاعت پر ان کے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے تصوف پر ایک کتاب لکھنی شروع کی، مگر ایک دو باب ہی لکھ سکے۔ اقبال کے علمی منصوبوں میں بہت سے موضوعات شامل تھے۔ مثلاً فصوص الحکم پر ایک تنقیدی جائزہ، قلب و دماغ کی سرگذشت وغیرہ۔ بہ قول رفیع الدین ہاشمی ''اقبال کے ان منصوبوں کا محرک ملّی انحطاط کا وہ شدید احساس تھا جس نے اقبال کو ساری عمر مضطرب رکھا۔ وہ تصنیفی منصوبوں کے ذریعہ چاہتے تھے کہ اپنے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں پر دین کے اثرات منکشف کر جائیں، تاکہ وہ دین کے قریب آجائیں۔[۴]

اقبال کو یہ احساس تھا کہ بڑے علمی منصوبوں کی تکمیل کے لئے اجتماعی کاوشوں، علمی اداروں اور اکیڈمیوں کی ضرورت ہوتی ہے، جیسا کہ یورپ میں ہورہا ہے۔ اقبال کے ایک نیاز مند خواجہ عبدالوحید نے ۱۹۳۸ء میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا، تاکہ مسلمان نوجوانوں کو اسلامی تمدن و تاریخ کے مطالعہ کی طرف راغب کیا جائے۔ علامہ اقبال کو اس ادارہ سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ اس سے کافی دلچسپی رکھتے تھے اور اس کے کاموں میں عملی تعاون کرتے تھے۔[۵]

پھر علامہ کی راہ نمائی میں ۱۹۳۱ء میں علوم اسلامیہ کی ترویج و تحقیق کے لیے لاہور میں ادارۂ معارف اسلامیہ قائم کیا گیا۔ علامہ اس کے روح رواں تھے۔ اس کے تمام کام ان کی راہ نمائی میں انجام پاتے تھے۔ اقبال کو بہ قول جعفر بلوچ اس ادارہ سے کافی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امیدیں وابستہ تھیں۔ اس کے لیے انھوں نے ریاست حیدرآباد سے سالانہ امداد بھی منظور کرائی تھی۔ بہ قول عبدالمجید سالک ''مدت دراز سے علامہ کے دماغ میں یہ تجویز گردش کررہی تھی کہ ایک علمی مرکز قائم کیا جائے، جہاں دینی و دنیوی علوم کے ماہر جمع کیے جائیں اور ان ماہروں کو خورد و نوش کی فکر سے آزاد کر دیا جائے، تاکہ ایک گوشہ میں بیٹھ کر علامہ کے نصب العین کے مطابق اسلام، تاریخِ اسلام اور شرعِ اسلام کے متعلق ایسی کتابیں لکھی جائیں، جو آج کل کی دنیائے فکر میں انقلاب پیدا کردیں''۔[6]

صاحب زادہ آفتاب احمد کے نام ایک خط میں وہ اسلامی تاریخ، آرٹ، قانون اور تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں پر حاوی عالموں کی تیاری، ان کی تعلیم و تربیت اور اسلامی ادبیات و افکار میں تحقیق کی ضرورت کا ذکر کرتے ہیں۔[7]

اس سلسلہ میں اپنے آخری دور میں علامہ کی ترجیحات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں: ''یہاں ایک دلچسپ نکتے کی نشان دہی ضروری ہے اور وہ یہ کہ آخری زمانے میں اسلامی فقہ میں تحقیق کا مسئلہ اقبال کی نظر میں جس قدر اہمیت اختیار کر گیا تھا، فلسفہ و تصوف جیسے موضوعات اسی قدر ان کی نظر سے گر گئے تھے۔ عملی زندگی خصوصاً مسلم نشاۃ ثانیہ کے ضمن میں فلسفے اور تصوف کی افادیت ان کی نظر میں مشکوک ہوگئی تھی۔ پروفیسر عمرالدین کے نام ۸ر مئی ۱۹۳۶ء کو لکھتے ہیں: مسلم فلسفے اور تصوف جیسے موضوعات میں میری زیادہ تر دلچسپی ختم ہوگئی ہے۔ اسلامی فقہ کے وہ اصول و ضوابط جن کا تعلق معاملات سے ہے اور جو دنیا کی اقتصادی اور تہذیبی تاریخ کے نقطۂ نظر سے کہیں زیادہ اہم ہیں، ان کے مقابلہ میں فلسفہ اور تصوف فقط قیاس آرائی (Mere Speculation) کی حیثیت رکھتے ہیں اور غیر شعوری طور پر یہ اسلام میں انتشار اور افتراق کا سبب بھی بنتے ہیں''۔[8]

چنانچہ ضربِ کلیم کی نظموں میں اس پر یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں ؎

ہے فلسفہ زندگی سے دوری — انجام خرد ہے بے حضوری
مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے — پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۹ رجنوری ۱۹۲۸ء کو پورے ملک میں یوم اقبال منایا گیا۔اس موقع پر سر سکندر حیات نے یہ تجویز پیش کی کہ ہر جگہ اقبال کو تھیلی پیش کی جائے۔علامہ نے یہ تجویز مسترد کر دی اور کہا کہ بہتر ہوگا کہ اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامی علوم کی تحقیق کے لیے ایک چیر یا خصوصی شعبہ قائم کیا جائے اور سرمایہ اس کے لئے فراہم کیا جائے۔ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ اقبال کی یہ اہم تمنا تھی کہ مسلم یونیورسٹی کے اندر یا کسی پرسکون مقام پر ایک چھوٹی سی بستی کی صورت میں ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں بہترین دل و دماغ کے مسلم نوجوان خالص اسلامی ماحول میں اسلامی ریاضیات، طبیعیات، کیمیا، تاریخ، فقہ اور دینیات کی تعلیم حاصل کر کے علوم جدیدہ کا علوم قدیمہ سے تعلق دریافت کر سکیں۔۹

اسی زمانہ میں چودھری نیاز علی جیسے دردمند کا سامنے آنا، اپنی جائیداد واقع جمال پور پٹھان کوٹ ضلع گرداس پور کا ایک حصہ خدمتِ دین کے لیے وقف کر کے وہاں درس گاہ قائم کرنے کے عزم کا اظہار نیک فال ثابت ہوا۔چودھری صاحب نے کئی علما سے راہ نمائی چاہی۔مولانا مودودی سے ان کی مفصل خط و کتابت ہوئی اور انھوں نے ایک تفصیلی نقشہ بنا کر انہیں ارسال کیا، جس میں انھوں نے علمی کام کے چار شعبے (فقہ، معاشیات، علوم عمران، فلسفہ اور نظری سائنس) کی نشان دہی کی اور یہ لکھا کہ ''سب علمی و تحقیقی کام اس بنیادی نظریہ سے کیا جائے کہ قرآن وسنت ہی علم کا اصل منبع ہے۔سب کچھ ہم کو اسی سے لینا ہے۔۱۰

چودھری نیاز علی نے علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے ارادہ سے آگاہ کیا اور دارالاسلام کے منصوبہ پر روشنی ڈالی۔علامہ بے حد خوش ہوئے اور انہیں بہ قول رفیع الدین ہاشمی اس منصوبہ میں اپنے خواب کی تعبیر نظر آئی۔علامہ نے پٹھان کوٹ کے علمی مرکز کے لیے جامعہ ازہر کے علامہ مصطفیٰ المراغی کو خط لکھا۔ یہ نہایت اہم مکتوب ہے۔

''ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کی ایک بستی میں ایسے ادارہ کی بنیاد رکھیں کہ اب تک کسی اور نے ایسا ادارہ قائم نہیں کیا اور ان شاء اللہ اسے اسلامی دینی اداروں میں بہت اونچی حیثیت حاصل ہوگی۔ہم یہ چاہتے ہیں کہ کچھ ایسے لوگوں کو، جو جدید علوم سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہرہ ورہوں، کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ یکجا کر دیں، جنہیں علوم دینی میں مہارت حاصل ہو اور جو اپنا وقت دینِ اسلام کی خدمت میں لگانے کو تیار ہوں۔ ہم ان لوگوں کے لئے نئی تہذیب اور جدید تمدن کے شوروشغب سے دور ایک دارالاقامہ بنا دیں، جوان لوگوں کے لیے ایک اسلامی مرکز کا کام دے۔ اس میں ہم ان کے لئے ایک لائبریری ترتیب دیں، جس میں وہ تمام قدیم و جدید کتابیں موجود ہوں، جن کی ضرورت پیش آسکتی ہو۔ مزید برآں ان کے لیے ایک کامل وصالح گائیڈ کا تقرر کیا جائے، جسے قرآن حکیم میں بصیرت تامہ حاصل ہواور جو دنیائے جدید کے احوال وحوادث سے بھی باخبر ہو، تاکہ ان لوگوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روح سمجھا سکے اور فلسفہ، حکمت ،اقتصادیات و سیاسیات کے شعبوں میں فکر اسلامی کی تجدید کے سلسلہ میں انہیں مدد دے سکے، تاکہ یہ لوگ اپنے علم اور قلم سے اسلامی تمدن کے احیا کے لئے کوشاں ہوسکیں۔ آپ جیسے فاضل شخص کے سامنے اس تجویز کی اہمیت کو واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، چنانچہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ازراہ کرم ایک روشن دماغ مصری عالم کو جامعہ ازہر کے خرچ پر بھجوانے کا بندوبست فرمائیں۔ یہ شخص علوم شرعیہ نیز تاریخ وتمدن اسلامی میں کامل دست گاہ رکھتا ہو اور یہ بھی لازم ہے کہ اسے انگریزی زبان پر قدرت حاصل ہو۔[11]

شیخ الازہر نے جواب دیا کہ ہمارے علمائے ازہر میں کوئی ایسا نہیں جو انگریزی زبان پر قدرت رکھتا ہو۔ سید نذیر نیازی اور میاں محمد شفیع کے بہ قول علامہ کی نظر سے مولانا مودودی کی تحریریں گذر چکی تھیں اور وہ ان کی علمیت اور فہم اسلام سے وہ مطمئن تھے۔ انہوں نے چودھری نیاز کو مشورہ دیا کہ وہ مولانا مودودی کو پٹھان کوٹ بلائیں۔ مولانا مودودی نے اس دعوت کو قبول کیا اور لاہور آکر چودھری نیاز علی خاں اور علامہ محمد اسد کے ساتھ علامہ اقبال سے ملاقات کی اور مجوزہ ادارہ کے منصوبوں ،منہاج اور طریقۂ کار پر ان سے مفصل بات چیت کی اور مارچ ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد دکن سے جمال پورہ پٹھان کوٹ منتقل ہوگئے۔ خود علامہ اقبال کا ارادہ تھا کہ ہر سال چند ماہ وہاں آکر قیام کریں۔ مولانا مودودی مشورہ ورہ نمائی کے لئے لاہور جانے کا پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ سید نذیر نیازی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا خط ملا کہ جس قدر جلد ممکن ہو لاہور آ یئے ، علامہ کی طبیعت بہت خراب ہے ۔اس خط کے تیسرے روز علامہ کی وفات ہوگئی'' ۔۱۲

اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید میں سرسید کی عقلیت کی تحریک بیسویں صدی کے آغاز میں غیر موثر ہوتی جا رہی تھی ، اگر چہ تقلید محض کے دائرہ سے نکل کر اسلام کی فکری توانائیوں کو قرآن حکیم سے اخذ کرنے اور مغرب کے فکری غلبہ سے دنیائے اسلام کے نوجوان ذہنوں کو نجات دلانے کے لیے ابھی کچھ اور قدم آگے بڑھانے کی ضرورت تھی ۔مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعہ نوجوان ذہنوں میں خود اعتمادی اور حرکت و عمل کی چنگاریاں پیدا کر دی تھیں ، مگر وہ مغرب کی فکر و فلسفہ کی گہرائیوں میں اتر کر اس کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہ تھے ۔عالم اسلام میں علامہ رشید رضا ، جمال الدین افغانی ، مفتی محمد عبدہٗ وغیرہ نے جدید ذہن کو بیدار کیا اور اسلامی سر چشموں سے فیض یاب ہونے کی راہیں ہموار کیں ۔ان لوگوں نے قرآن کو رہ نما بنایا اور وحی الٰہی پر اپنے افکار و خیالات کی بنیاد رکھی ، لیکن بیسیویں صدی کے ربع اول میں اقبالؔ جیسا مفکر دنیائے اسلام کو مشیت نے عطا کیا ، جو اس عہد کے متکلمین اور فقہا میں امتیازی مقام کا حامل ہے ۔پروفیسر سمیع اللہ قریشی کے الفاظ میں ''ہر تہذیب کی فکری بنیاد فلسفہ پر استوار ہوتی ہے جس کے سہارے وہ سیاسی ، ثقافتی ، عمرانی تعلیمی اور معاشی تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتی ہے ۔تہذیبی زوال آمادگی کا مرض اس وقت لاحق ہوتا ہے جب ان کا اندازِ فکر و نظر اور علم و عمل عصری تقاضوں کی پروا نہیں کرتا ۔کسی تہذیب پر بیتنے والا یہ لمحہ بے حد نازک ہوتا ہے'' ۔۱۳

اقبالؔ جس عہد میں پیدا ہوئے برصغیر کے مسلمان عوام ذہنی طور پر پس ماندہ اور فکری سطح پر احساس محرومی کا شکار تھے ۔ان پر مایوسی کی کیفیت طاری تھی ۔پہلی جنگ عظیم میں ترکی کی شکست اور خلافت کے زوال سے وہ اور پژمردہ تھے ۔خود اعتمادی سے محروم تھے اور ماضی پرستی کا شکار تھے ۔علامہ اقبالؔ کو احساس تھا کہ 'اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید اسلام کی تاریخ میں ایسا وقت پہلے کبھی نہ آیا تھا'' ۔۱۴

''مسلمانوں پر اس وقت روحانی اعتبار سے وہی زمانہ آ رہا ہے جس کی ابتدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی۔ مگر چوں کہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت رہ نما نہیں ہے اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں''۔ ۱۵؎

اقبال کو مسلسل یہ فکر دامن گیر تھی کہ آخر کس طرح عصر جدید کے تقاضوں اور چیلنج کا مسلمان سامنا کریں۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو لکھتے ہیں: ''افسوس ہے، زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانے کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ مذہب اسلام اس وقت زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے''۔ چنانچہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے موضوع پر اقبال مسلسل سوچتے رہے اور اس کے لیے منصوبے بناتے رہے۔ وہ اس عمل میں اسلامی مشرقی روایات کا کوئی حصہ ترک کرنے پر تیار نہ تھے اور مغربی افکار کو بھی تمام تر رد کر دینے کے قائل نہ تھے، جیسا کہ اپنے خطبات میں مشرق کے فکری اثاثہ کو انھوں نے بڑے فخر سے پیش کیا اور مغرب کے سائنسی رویہ اور محسوسات سے گہرا رابطہ قائم رکھنے کے طرز عمل کی تحسین کی۔ ان کے نزدیک یہ رویہ خود مسلمانوں کی میراث ہے۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ مغرب سے قطعاً مرعوب نہیں تھے اور اس کے سائنسی طرز فکر کی قدر کرنے کے باوجود اسلامی اقدار کی رفعت اور مشرق کی اس پہلو سے مغرب پر برتری کا کھل کر اظہار کرتے رہے۔

اقبالؔ اسلام کو عصر رواں میں بھی ایک زندہ قوت تسلیم کرتے تھے۔ وہ اگرچہ بے روح قدامت پرستی کے سخت خلاف تھے، لیکن ان کی تنقید سر سید کی طرح ذہنی مرعوبیت کا نتیجہ نہ تھی۔ انہوں نے ۱۹۳۱ء کی مسلم کانفرنس میں ارشاد فرمایا: ''مگر آپ کے مذہب کا یہ اعلیٰ تخیل مولویوں اور فقہ پرستوں کی دقیانوسی خیال آرائیوں سے رہائی کا طالب ہے۔ یہ بات بوڑھی نسل کے لیے باعث شرم ہے کہ ہم نوجوان نسل کو اقتصادی، سیاسی نیز مذہبی خطرناک مواقع کے لیے جو موجودہ دور اپنے ہم راہ لا رہا ہے، مسلح کرنے سے قاصر رہے ہیں''۔ ۱۶؎

اقبالؔ اسلام کو ایک سراپا متحرک دین سمجھتے تھے۔ یہ حیات و کائنات کی ماہیت کے عرفان پر زور دیتا ہے اور ان کے مطابق زندگی کے میلان و رجحان کا نام ہے۔ اسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جمود و تعطل سے سخت نفرت ہے۔ ان کو یقین تھا کہ اسلامی فکر اب انقلاب وارتقا کی راہ پر گام زن ہے اور اسے کوئی قوت دبا نہیں سکتی۔ انہوں نے واضح الفاظ میں یہ خیال ظاہر کیا:

''اسلام جدید تفکر اور تجربے کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے اور کوئی ولی یا پیغمبر بھی اس کو قرون وسطیٰ کے تصوف کی تاریکی کی طرف واپس نہیں لے جا سکتا''۔[۱۷]

اقبال قسطنطنیہ کے شعبۂ دینیات کے سربراہ کو مشورہ دیتے ہیں: ''ادارۂ دینیات پر کسی ایسے شخص کو پروفیسر متعین کیا جائے جس نے اسلامی دینیات اور جدید یورپین فکر و تصورات کا مطالعہ کیا ہو، تا کہ وہ مسلم دینیات کو افکار جدیدہ کا ہم پایہ بنا سکے۔ قدیم اسلامی دینیات کا تار و پود بکھر چکا ہے، جس کا مدار زیادہ تر یونانی حکمت پر تھا۔ وقت آ چکا ہے کہ اس کی نئی شیرازہ بندی کی جائے''۔[۱۸]

اقبال اسلامی فکر کی نشأۃ ثانیہ کے لئے کس قدر مضطرب تھے اور ان کے سامنے کیا ترجیحات تھیں اس کا بہ خوبی اظہار ان کے خطبات مدراس سے ہوتا ہے جو 'اسلامی الٰہیات کی تشکیل نو' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان خطبات کے مقدمہ میں اقبالؔ نے اپنی فکر کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''میں نے اسلام کی روایات فکر، علیٰ ہذا ان ترقیات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو علم انسان کے مختلف شعبوں میں حال ہی میں رونما ہوئیں، الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید سے ایک حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مطالبہ غلط نہیں کہ مذہب کی بدولت ہمیں جس قسم کا علم حاصل ہوتا ہے اسے سائنس کی زبان میں سمجھا جائے۔ یہ وقت اس طرح کے کسی کام کے لیے بے حد مساعد ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ مذہب اور سائنس میں ایسی ایسی ہم آہنگیوں کا انکشاف ہو جو سر دست ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، تاہم یہ یاد رکھنا چاہئے کہ فلسفیانہ غور و فکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں۔ جیسے جیسے جہانِ علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے، فکر کے لیے نئے نئے راستے کھل جاتے ہیں اور شاید ان نظریوں سے، جو ان خطبات میں پیش کیے گئے ہیں، زیادہ بہتر نظریے ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ ہمارا فرض بہر حال یہ ہے کہ فکر انسانی کی نشو و نما پر بہ احتیاط نظر رکھیں اور اس باب میں آزادی کے ساتھ نقد و تنقید سے کام لیتے رہیں''۔ پھر غلام بھیک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نیرنگ کو، خطبات کے اردو ترجمے کے سلسلہ میں جو مشکلات درپیش تھیں، اس کے تناظر میں لکھتے ہیں:

"ان خطبات کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفہ سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفۂ اسلام کو فلسفۂ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے اور اگر پرانے تخیلات میں خامیاں ہیں تو ان کو رفع کیا جائے۔ میرا کام زیادہ تر تعمیری ہے اور اس تعمیر میں فلسفۂ اسلام کی بہترین روایات کو ملحوظ خاطر رکھا ہے"۔[19]

اقبالؔ نے اپنے خطبات میں بڑے حیات افروز تصورات پیش کیے ہیں۔ ان کے نزدیک حیات ایک ایسا جوہر ہے جو انسان کی خارجی و داخلی سمتوں کو متصل کرتا ہے۔ عالم موجودات میں ہر چیز متحرک ہے اور زندگی میں یقین محکم کے بغیر کسی مثبت عمل کی توقع عبث ہے۔ ان کے نزدیک انسان کامل کی خودی بقائے دوام حاصل کرتی ہے۔ مادے کو انھوں نے ایک ایسی روح قرار دیا ہے جو زماں و مکاں میں محصور ہے۔ درحقیقت یہی روح وحدت انسانی ہے جو نصب العین کی تلاش میں سرگرم عمل ہے اور اسی نصب العین کو زماں و مکاں میں متشکل کرنے کی آرزو دراصل قیام مملکت کا دوسرا نام ہے۔[20]

اسلامی ثقافت کے بارے میں اقبال بڑی فکر انگیز بات کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی ثقافت کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ مشاہدات کے لیے زاویۂ نظر بدلتے ہی تصورات کو نیا مفہوم مل جائے۔ کیوں کہ اسلام بذات خود تحریک ہے جو ہر دور کے تغیرات کو اپنے اندر جذب کر کے تجربہ اور روایت کو نئے سرے سے منظّم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن محض عقیدہ کے بجائے عمل یعنی تجربہ پر زور دیتا ہے۔ ان کے نزدیک جب تک اسلام ایک تہذیبی قوت رہا مسلمان دنیا پر چھائے رہے۔ جوں ہی مذہب عقاید و رسوم کا ایک انبار بنا اشاعت اسلام اور اسلام کے تہذیبی افق کی وسعت کا عمل رک گیا۔[21]

اقبالؔ اپنے خطبات اور دیگر تحریروں میں جگہ جگہ قرآن حکیم سے اپنے گہرے تعلق کا اظہار کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خطبات میں یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کے اس دعویٰ کو کہ وہ ایک مربوط، جامع اور متحرک نقطۂ نظر ہے، ثابت کیا جائے۔ انھوں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ثابت کیا کہ قرآن ایمان وتعقل کے درمیان کسی تفریق کا قائل نہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک مذہب اور سائنس کی منزلِ مقصود ایک ہے۔ وہ ایک فلسفی تھے، لیکن انھوں نے فلسفہ کو دین اور انسانی زندگی کے عملی مراحل سے ہم آہنگ بنا دیا اور خود فلسفہ پر اپنی اس تنقید کی اپنی دیگر تحریروں سے تردید کی۔

ہے فلسفہ زندگی سے دوری ایام خرد ہے بے حضوری

انھوں نے ثابت کیا کہ ایک فلسفی دین کے اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے دین کے افکار کی تشکیل وترتیب نو میں حصہ لے کر اس کی آب وتاب بڑھا سکتا ہے۔ اس کے لیے وہ صرف عقل پر بھروسہ کرنے کے بجائے وحی والہام کی روشنی میں قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ بہ قول پروفیسر سمیع اللہ اقبالؔ نے یہ ثابت کیا کہ دین کے اصولوں کی وضاحت فلسفہ کے تعاون سے کی جا سکتی ہے۔

اقبالؔ کے عہد میں قوم پرستی ووطن پرستی ایک عقیدہ بن کر مغرب کے اثرات کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں پر بھی مسلط تھی اور یہ خیال عام تھا کہ اس عہد میں انسانوں کو یہی تصور بہتر طریقہ سے مربوط کر سکتا ہے۔ کانگریس اور دیگر سیاسی واجتماعی تحریکوں کا اس پر پختہ ایمان تھا۔ عالم اسلام بھی پورے طور پر اس کی گرفت میں تھا۔ اقبالؔ نے ڈٹ کر اس تصور کی مخالفت کی۔ مولانا حسین احمد مدنی کے خط کے جواب میں انھوں نے اختصار کے ساتھ اپنے موقف کی وضاحت ان الفاظ میں کی:

”اگر عالم انسانیت کا مقصد اقوام متحدہ کا امن وسلامتی اور ان کی موجودہ ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دینا ہے تو سوائے نظام اسلامی کے کوئی دوسرا نظام ذہن میں نہیں آسکتا، کیوں کہ قرآن سے میری سمجھ میں جو کچھ آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں، بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تاریخی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی ونسلی نقطۂ نظر کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے“۔[۲۲]

علامہ اقبالؔ نے مغرب میں جنم لینے والے جذبۂ قومیت ووطنیت کو ان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مجبوری قرار دیا کہ ان کے پاس کوئی عالم گیر سیاسی و اخلاقی نظام موجود نہ تھا اور مسیحی دنیا کو مربوط کرنے کا یہی نسخہ ان کی سمجھ میں آیا اور انہوں نے یہ تصور کرلیا کہ سیاسی اتحاد و اتفاق کا وجود عقیدۂ وطنیت کے تحت ہی ممکن ہے۔ انھوں نے اس باطل نظریہ پر اپنے ۱۹۳۰ کے آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں کھل کر تنقید کی ہے اور اپنی متعدد نظموں میں وطنیت وقومیت پر نشتر چلایا ہے۔

جو کرے گا امتیاز رنگ وخوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اڑگیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گذر
اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب پر نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

اقبالؔ نے اپنے فکری نظام میں فلسفہ کے ساتھ سائنس کو خصوصی توجہ کا محور بنایا اور قرآن وحدیث کی روشنی میں سائنس کے منہاج غور وفکر کا مطالعہ کیا۔ بہ قول پروفیسر سمیع اللہ موحد ہونے کی بنیاد پر انہوں نے مادہ، انسان، ذہن اور زندگی کے ظاہری اختلاف میں حقیقت واحدہ کو تلاش کیا۔ ہر چند کہ انسانی تہذیب کے ان تینوں اداروں: مذہب، فلسفہ اور سائنس کی زبان قواعد اور طریق کار میں کافی اختلاف موجود ہے تاہم اقبال قرآن کی روشنی میں ان تینوں میں کوئی تضاد محسوس نہیں کرتے، کیوں کہ ان کے نزدیک یہ تینوں انسان کے لیے حقیقت واحدہ کی تفہیم میں مدومعاون ٹھہرتے ہیں اور ساتھ ہی ترقی پذیر انسانی تمدن کو مختلف مراحل طے کرانے کا باعث بنتے ہیں'۔[۲۳]

اقبالؔ کے نزدیک سائنٹفک انداز سے کائنات اور اس کی اشیا کا مطالعہ اسلام کی ایک خاص عنایت ہے، جیسا کہ اقبالؔ نے واضح کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکمت اشیا فرنگی زادہ نیست　　اصل او جز لذت ایجاد نیست
چوں عرب اندر اروما پر کشاد　　علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند　　حاملش افرنگیاں برداشتند

عمیق مشاہدہ اور تجرباتی مطالعہ کا آغاز مسلمانوں نے کیا، چنانچہ رابرٹ بریفالٹ اپنی مشہور کتاب The Making of Humanity میں لکھتے ہیں: ''آج یورپ میں جس سائنسی ترقی کا دور دورہ ہے اس کی بنیاد عربوں نے ہی استوار کی تھی۔ یونانی تو تجرباتی اصول سے بالکل نا آشنا تھے''۔[۲۴]

مشہور فرانسیسی سائنس داں سیڈیلو بھی اس کی تائید کرتا ہے: ''وہ (عرب) معلوم سے نا معلوم کی طرف آتے تھے اور کسی ایسی بات کو سچ نہ مانتے تھے جس کی تائید و توثیق ذاتی تجربہ یا تجربہ گاہ سے نہ ہوتی۔ سائنس کے مسلمان استادوں نے انھی اصولوں کی تعلیم دی اور انھی کا دعویٰ کیا''۔ رسالہ اسلامک ریویولندن کے مارچ ۱۹۵۵ کے شمارہ میں جان ڈبلیو کیمپبل جونیر اعتراف کرتے ہیں: ''ہم نے سائنس کی میراث روما سے لی ہے نہ یونان سے، بلکہ اسلام سے لی ہے''۔

اقبالؔ بیسویں صدی کے ان نمایاں مفکرین میں سے ہیں جنھوں نے فکرِ انسانی کی نشو ونما میں آزادی کے ساتھ تنقید کا دروازہ کھلا رکھنے کی حمایت کی۔ وہ تصوف پر اس لیے معترض تھے کہ وہ غور و فکر کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے ساتھ ایک گفتگو میں انھوں نے یہ تسلیم کیا: ''وہ فلسفہ اور مذہبی تعلیم، جو انسانی شخصیت کی نشو ونما کے منافی ہو، بے کار چیز ہے۔ تصوف نے سائنٹفک روح کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ گوش و چشم کو بند کرنا اور صرف چشمِ باطن پر زور دینا جمود و انحطاط ہے، قدرت کی تسخیر کی جگہ سہل طریقوں کی تلاش ہے۔ خالص اسلامی تصوف یہ ہے کہ احکامِ الٰہی انسان کی اپنی ذات کے لیے احکام بن جائیں۔[۲۵]

اقبالؔ نے کائناتی اسرار کا انکشاف ایک مسلمان کی اولین ذمہ داری قرار دی۔ مذہب و سائنس کا مستقبل ان کے نزدیک ایک سا ہے اور انھوں نے، پروفیسر سمیع اللہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قریشی کے الفاظ میں، مذہبی تجربے کے لیے عمل کا وہی معیار مقرر کیا جو سائنسی تجربہ کے اثبات کے لیے عقل ٹھہراتی ہے۔ اقبالؔ ہمیں مذہب کے معاملہ میں جس شعور سے آشنا کراتے ہیں وہ سائنسی حقائق کا ہی بخشندہ شعور ہے''۔۲۶

۱۹۱۱ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے صدارتی خطبہ میں اقبال نے فرمایا: ''میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ اصولوں کا سرچشمہ ہے۔ یورپ میں علم کا پندرہویں صدی میں چرچا مسلمانوں ہی کی یونیورسٹیوں سے ہوا''۔ ۱۹۱۰ء میں آغاز سرما میں اسٹریچی ہال ایم اے او کالج علی گڑھ میں علامہ اپنے خطبہ بہ عنوان 'ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر' میں مسلمانوں کے دورِ اول کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''اس دن سے، جب کہ اسلام کا سنگ بنیاد رکھا گیا، سولہویں صدی کے آغاز تک، یعنی تقریباً ایک ہزار سال کا زمانہ اس بے چین قوم نے ملک گیریوں اور جہاں کشائیوں میں صرف کیا۔ اگرچہ اس ہمہ گیر مشغلہ میں منہمک ہونے کے باعث انہیں کسی دوسرے شغل کی فرصت نہ ہوسکتی تھی، لیکن پھر بھی اسلامی دنیا نے علم وحکمت کے قدیم خزانوں کو ڈھونڈھ نکالا اور ان پر اپنی طرف سے معتد بہ اضافہ کر کے ایک عدیم النظیر لٹریچر کا سرمایہ دنیا کے سامنے پیش کیا اور ایک ایسا جامع و مانع نظام فقہ مدون کیا، جو اسلامی تمدن کا غالباً سب سے گراں مایہ ترکہ ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب وشائستگی کا معیار بھی عالم گیر ہے''۔۲۷

اقبال اس خطبہ میں ایک ایسی یونیورسٹی کا خواب دیکھتے ہیں جو اسلامی فکر ونظر اور اسلامی تہذیب کو فروغ دے۔ وہ فرماتے ہیں: ''کوئی قوم اس رشتہ کو یک بیک نہیں توڑ سکتی جو اسے ایام گذشتہ سے جوڑے ہوئے ہے اور مسلمان کے لئے تو اس تعلق کو چھوڑ دینا اور بھی محال ہے۔ مسلمان کو بے شک علوم جدیدہ کی تیز رفتار کے قدم بہ قدم چلنا ہے، لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی ہو۔ اخلاق و مذہب کی تلقین کے لیے موجودہ زمانہ کے مبلغ کو تاریخ اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دست رس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رکھنی چاہئے''۔۲۸

اقبال اپنی زندگی کے آخری دور میں مسلسل مسلمانوں کے مغرب کے بالمقابل اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور اپنی متاع گم شدہ یعنی علم وحکمت کی بازیافت کرنے کی تمنا کا اظہار کرتے رہے اور اس کے لیے اہلِ علم میں ذوق طلب وشوق جستجو پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وفات سے کچھ ہی دنوں پہلے ۱۹/ مارچ ۱۹۳۸ء کی ایک گھریلو نشست میں انہوں نے فرمایا: ''مسلمانوں کا علمی ورثہ بڑا عظیم اور قابلِ فخر ہے۔ علم وحکمت کی کوئی شاخ نہیں ہے جس پر ان کی ذہانت واجتہاد کا نقش ثبت نہ ہو۔ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے صحیح معنوں میں علمی روح پیدا کی اور علوم وفنون کو ان کے اصل راستے پر ڈال دیا۔ علم کا وجود، جسے آج کل سائنس کہتے ہیں، انہی کا مرہونِ منت ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے وہ شرائط بہم پہنچائیں جن پر علم کی ترقی اور نشوونما کا دارومدار رہا ہے۔ یہ شرائط کیا تھیں؟ مشاہدہ، معاینہ، فکرونظر، محسوس اور غیر مرئی کا احترام، تجربہ وتحقیق، تفتیش، حقائق کا اثبات، ان کا مطالعہ اور ان کی مسلسل تاویل وتعبیر۔ یہ شرائط یوں نہ ہوتیں تو علم کا راستہ دیر تک رکا رہتا''۔۲۹

اقبال کو اس بات پر بے حد تشویش تھی کہ ''آج مسلمانوں میں علمی تجسس کا فقدان ہے۔ عالم اسلام کا ذہنی انحطاط حد درجہ اندوہ ناک ہے۔ مسلمانوں میں علمی روح باقی ہے نہ علم وحکمت سے کوئی دلی شغف۔ وہ علم وحکمت کی صحیح روح کو سمجھتے ہیں نہ اس کے ماضی کے عہد بہ عہد ارتقاء انقلابات اور تغیرات کو۔ اگر کچھ ہے تو تقلید یا پھر یورپ سے چند ایک مستعار لیے ہوئے خیالات کا اعادہ''۔

اپنی زندگی کی آخری مجالس میں انہوں نے حسرت سے اپنے اس درد وکرب کا اظہار کیا: ''جس مایوسی ودل گرفتگی میں آج کل دنیا گرفتار ہے اور جس کے زیر اثر انسانی تہذیب کو ایک زبردست خطرہ لاحق ہے اس کا علاج نہ تو عہد وسطیٰ کی صوفیانہ تحریک سے ہوسکتا ہے، نہ جدید زمانہ کی وطنیت اور لادینی اشتراکی تحریکوں سے۔ اس وقت دنیا کو حیات نو کی ضرورت ہے۔ اگر عصر حاضر کا انسان دوبارہ وہ اخلاقی ذمہ داری اٹھائے گا جو جدید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سائنس نے اس پر ڈال رکھی ہے تو صرف مذہب کی بدولت۔صرف اسی طرح اس کے اندر ایمان ویقین کی کیفیت کا احیا ہوگا جس کی بدولت وہ اس زندگی میں ایک انفرادیت پیدا کرتے ہوئے آگے چل کر بھی اسے محفوظ اور برقرار رکھ سکے گا''۔[۳۰]

علامہ نے اسلامی فکر وفلسفہ کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے امتیازات پر بڑی تفصیل سے اپنے خطبات میں روشنی ڈالی ہے۔ان کے نزدیک ایک کامیاب زندگی کے لیے ہماری عملی کش مکش وہی رنگ اختیار کرلے گی جیسا ہمارا اخلاق اور روحانی نصب العین، لیکن جس میں ہم اپنے غور وتفکر اور واردات باطن کے ساتھ واقعیت کی اس دنیا سے منہ نہیں موڑیں گے جو محسوس حقائق اور لحظہ بہ لحظہ بدلتے ہوئے واقعات وحوادث کی شکل میں ہمارے سامنے آتی اور جواباً کسی عمل پر مجبور کرتی ہے۔[۳۱]

علامہ چاہتے تھے کہ ہم اپنے تاریخی افکار کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کر کے وہ روایات ازسرنو قائم کریں جن کا تعلق خالصاً اسلامی فکر سے ہے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ مغرب نے مسلمانوں کی تاریخ فلسفہ کو بڑے گم راہ کن انداز میں پیش کیا اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کا کوئی فکری نظام ہی نہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے علم وعمل کی دنیا میں ایک بنیادی اور ہمہ گیر انقلاب پیدا کردیا۔ضرورت ہے کہ ہم اپنے تاریخی افکار کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کریں اور وہ روایات ازسرنو قائم کریں جن کا تعلق خالصاً اسلامی فکر سے ہے۔اقبالؔ مسلمانوں کے دورزوال میں بھی اسلامی فکر کے ارتقا کے تسلسل کو محسوس کرتے تھے اور اسے بیسویں صدی اور اس کے بعد بھی جاری رکھنے کے لیے نوجوان مفکرین کی تربیت کے آرزومند تھے۔اسی اسلامی فکر کی تشکیل جدید کی فکر اور اس کے لیے اسلامی دنیا کے دانش وروں کو بیدار کرنے کی غرض سے انھوں نے اپنے مشہور خطبات مرتب کیے، جو مدراس، حیدرآباد اور علی گڑھ میں پیش کیے گئے، جن میں شعور انسانی کی کامل بیداری کا پیغام پنہاں ہے۔ان کے مطالعۂ قرآن نے یہ حقیقت ان پر منکشف کی تھی کہ اسلام سمع، بصر، فواد وقلب کے ذریعہ بار بار فکر اور علم پر زور دیتا ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔قرآن غور وتفکر کا سرچشمہ ہے۔نذیر نیازی کے الفاظ میں: اقبال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چاہتے تھے کہ تعلیمات قرآنی پر ہم اپنے ذہن کو مرتکز کر کے یہ معلوم کریں کہ اسلام کا مطمحِ نظر عالم انسانی کے بارے میں کیا ہے؟ وہ ہم سے کس قسم کی زندگی کا طالب ہے؟ ہمارے اخلاقی و مادی نشو و نما کے ساتھ ساتھ حیات فرد اور استحکام جماعت کی طرح تہذیب انسانی کے حفظ و ارتقا کی اساس کن اصولوں پر رکھتا ہے؟ لہٰذا بہ حیثیت ایک جامع و ہمہ گیر تحریک کے اس کا ماضی کیا ہے؟ حال و مستقبل کیا ہے؟ ہماری حیات ملی کا گذر کن کن مراحل سے ہوا؟ وہ کیا مشکلات تھیں جو ہمیں اپنے ثقافتی نصب العین اور مذہبی اور روحانی زندگی کے اظہار میں پیش آئیں؟ ہماری میراثِ علم و حکمت اور سرمایۂ ادب کیا ہے؟ ہم نے تاریخ عالم کا رخ کس طرف موڑا؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم حسب سابق ان قوتوں کو پھر سے اپنے تصرف میں لائیں جو تقدیر انسانی کی صورت گر ہیں اور جس کے بغیر ہمارے اخلاق و روحانیت ہی کے کچھ معنی ہیں نہ اعمال و عقاید کے؟''۔۳۲

اقبال اس باب میں واحد رہنمائی قرآن سے حاصل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں کہ قرآن کا مطالعہ بہ حیثیت ایک رہنما کتاب کے کریں نہ کہ پہلے سے قائم شدہ افکار و تصوف کی روشنی میں۔ وہ قرآن کو ایسا دستور حیات قرار دیتے ہیں جس کی تکمیل حضور اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے اس طرح ہوئی کہ صدیوں کے زوال و انحطاط کے باوجود اس کی اصل حقیقت نہ کبھی ارباب بصیرت سے چھپ سکی، نہ عالم اسلام کی تاریخ ان ہستیوں سے خالی رہی، جن کی زندگی کا مقصد ہی یہ تھا کہ عملاً اس کے قیام و بقا کی سعی کرتے رہیں۔ قرآن حکیم سے اس وقت بھی عالم انسانی کی تقدیر وابستہ ہے۔ اقبال کو اس بات پر تشویش ہے کہ اس وقت فتنۂ استشراق اور زوالِ علم کی وجہ سے خود مسلمان قرآن کی صحیح روح سے غافل ہو گئے ہیں اور اپنے ماضی سے بیزار اور مستقبل سے مایوس ہیں۔ نذیر نیازی کے الفاظ میں: اقبال کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ہم جس فضا میں سانس لے رہے ہیں وہ مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب و تمدن کے تصرف و استیلاء کے باعث ان خیالات سے معمور ہے جن پر علم حاضر کی انتہا ہوئی ہے، لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ علم و حکمت کی تاریخ یا تہذیب و تمدن کا کوئی منظّم اور مربوط بیان ہے تو وہی جو اہل مغرب پیش کرتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمارے پاس کچھ ہے تو چند متفرق اور منتشر حقائق کے چند ادھورے اور بے ربط نظریات، اس لیے ہمارا غور و فکر اور ہمارا ذوق تجسس بالآخر وہی راستہ اختیار کرلیتا ہے جو دانایانِ فرنگ کا ہے۔ اس لیے ہم وہ سب نتائج قبول کرلیتے ہیں جو مغربی علم و فضل نے ہمارے ماضی کی تعبیر میں قائم کر رکھے ہیں''۔ علامہ چاہتے تھے کہ ہم اس علم و فضل سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں اور ابداع سے کام لیں۔ ہمیں فکر مستعار اور فکر خلّاق میں فرق کرنا ہوگا۔ اخذ و اکتساب سے آگے بڑھ کر ماضی و حال پر نقد و تفحص سے نظر ڈالیں اور شان اجتہاد سے آگے بڑھیں۔

نذیر نیازی کے الفاظ میں علامہ کے اندر قرآن حکیم کی تعلیمات نے وہ نظر پیدا کی جس نے ان حقائق کا اعتراف کرتے ہوئے، جو ہمارے شعورِ ذات اور علم و عمل کا نقطۂ آغاز ہے، ایک ایسے فکر کی طرح ڈالی جس کی شان خلاقی اور جامعیت کا یہ عالم ہے کہ اس نے حقیقت کا ایک تصور پیش کیا جو ان نقائص سے پاک ہے جو مختلف نظامات فلسفہ میں بالعموم موجود ہیں اور انہیں واقعیت سے دور کر دیتی ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ علامہ مشرق و مغرب کی تاریخ فلسفہ اور تہذیب و تمدن پر پوری نظر رکھتے ہیں اور وہ اپنے نتائجِ فکر کو جدید زبان میں پیش کرتے ہیں۔

اقبال اپنے خطبات کے دیباچے میں واضح الفاظ میں لکھتے ہیں کہ ''قرآن فکر کے بجائے عمل پر زور دیتا ہے اور عہد حاضر کا انسان اسے محسوس یعنی اس قسم کی فکر کی عادت ہوگئی ہے جس کا تعلق اشیا اور حوادث کی دنیا سے ہے اور یہ وہ عادت ہے جس کی اسلام نے اور نہیں تو اپنے تہذیبی نشو و نما کے ابتدائی دور میں حمایت کی، لہٰذا وہ ان واردات کا اور بھی اہل نہیں رہا، بلکہ انہیں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے، کیوں کہ وہم و التباس کی پوری پوری گنجائش ہے''۔[۳۳] لیکن اقبال ان صوفیا کی خدمات کا بھی اعتراف کرتے ہیں جنھوں نے دور اول میں ''ہم مسلمانوں میں مذہبی احوال و واردات کی تشکیل اور رہ نمائی میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن آگے چل کر جو حضرات اس میدان میں تھے وہ موجودہ دنیا کے افکار و تجربات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ اقبال کے نزدیک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عصر حاضر میں کسی ایسے منہاج کی ضرورت ہے جو عضویاتی اعتبار سے شدید بدنی ریاضت کا طالب نہ ہو، مگر نفسیاتی اعتبار سے اس ذہن سے قریب تر ہو جو گویا محسوس کا خوگر ہو چکا ہے، تا کہ وہ اسے بہ آسانی قبول کر لے......یعنی مذہب کی بدولت ہمیں جو علم حاصل ہوتا ہے اسے سائنس کی زبان میں سمجھا جائے''۔[۳۴]

غرض علامہ اقبال نے گذشتہ صدی میں مسلمانوں کی فکری دنیا میں ایک انقلاب پیدا کیا، جو سرسید کی علی گڑھ تحریک سے کہیں زیادہ انقلاب آفریں تھا اور جس سے فکر و خیال اور عملی انقلاب کے متعدد چشمے پھوٹ پڑے۔ متعدد اہل قلم نے اس کا مفصل طور پر جائزہ لیا ہے۔

حواشی و مراجع

۱۔ رفیع الدین ہاشمی، اقبال ریویو حیدر آباد، نومبر ۲۰۰۹، ص ۳۶

۲۔ اقبال ریویو حیدر آباد، ص ۳۶

۳۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، اقبال اکیڈمی لاہور، ص ۱۲۵

۴۔ اقبال نامہ بحوالہ، رفیع الدین ہاشمی، علامہ اقبال شخصیت اور فن، ص ۲۴۲، لاہور

۵۔ جعفر بلوچ، مجالس اقبال، دار التذکیر لاہور، ۲۰۰۳ء

۶۔ عبدالمجید سالک، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۵۵ء

۷۔ اقبال نامہ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، لاہور

۸۔ نقوش اقبال، حصہ دوم، دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۱۸

۹۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، سرگزشت اقبال، بحوالہ رفیع الدین ہاشمی، اقبال ریویو، ۲۰۰۹ء

۱۰۔ اسعد گیلانی، اقبال دار اسلام اور مودودی

۱۱۔ رفیع الدین ہاشمی (مرتب)، خطوط مودودی، مزید ملاحظہ کیجیے: رفیع الدین ہاشمی، خطوط اقبال، خیابان ادب، لاہور، ۱۹۷۶ء

۱۲۔ بحوالہ اقبال ریویو، نومبر، ۲۰۰۹ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۳۔ پروفیسر سمیع اللہ قریشی، موضوعات فکر اقبال، اقبال اکیڈمی، پاکستان ص ۹

۱۴۔ بحوالہ فقیر وحید الدین، روزگار فقیر

۱۵۔ اقبال نامہ

۱۶۔ بحوالہ موضوعات فکر اقبال، اقبال اکیڈمی، لاہور ص ۱۱

۱۷۔ حرف اقبال، بحوالہ موضوعات فکر اقبال، ص ۱۲

۱۸۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ

۱۹۔ بحوالہ موضوعات فکر اقبال، ص ۱۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۶

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۷

۲۲۔ روزنامہ احسان، مارچ ۱۹۲۸ء

۲۳۔ موضوعات فکر اقبال، ص ۸۲

۲۴۔ بحوالہ محمد رفیع الدین، حکمت اقبال، لاہور، ص ۲۱۷

۲۵۔ محمود نظامی، ملفوظات اقبال، ص ۱۶۲

۲۶۔ موضوعات فکر اقبال، ص ۸۵

۲۷۔ علامہ اقبال، ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، مترجم مولانا ظفر علی خاں، اقبال اکیڈمی لاہور

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۴

۲۹۔ سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور میں، کراچی، جولائی ۱۹۷۱ء، جز واول، ص ۳۷۴

۳۰۔ بحوالہ موضوعات فکر اقبال ص ۱۰۹

۳۱۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۶

۳۲۔ ایضاً، مقدمہ، ص ۳۱

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۵

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۶

☆☆☆

© rasailojaraid.com